© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دستور میں ترمیم یا دستور کی قلب ماہیت؟

خورشید احمد

انسانی معاشرے کے استحکام اور ترقی کے لیے جہاں مخلص' نیک اور باصلاحیت قیادت ضروری ہے وہیں قانون کی حکمرانی اور بنیادی اداروں کا تحفظ اور استقلال بھی ضروری ہے۔ افراد فانی ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ادارے اگر مستحکم ہوں تو قیادت کی تبدیلی کے باوجود نظام جاری و ساری رہتا ہے۔ جہاں ادارے کمزور ہوں اور سارا انحصار فانی انسانوں پر ہو' وہ نظام مٹی کے گھروندے کے مانند ہوتا ہے جو افراد کی تبدیلی سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ ناقابل فراموش سبق ہے کہ اصل استحکام اور ترقی اداروں کے استحکام اور احترام سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے بقا اور استحکام کے لیے جو نسخہ تجویز فرمایا وہ علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین (تم پر لازم ہے کہ میری سنت کی اور خلفاے راشدین کی سنت کی پیروی کرو) سے عبارت ہے' اور یہ ہدایت اور اداروں کا تسلسل اور تواتر ہی ہے جس نے اس امت کو تاریخ کے سارے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کی۔

آج پاکستان جس بحران کا شکار ہے اس کا ایک بڑا ہی اہم پہلو اداروں کے استحکام سے غفلت اور اغماض ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس بدنصیب قوم کی سیاسی قیادت تمام ہی بنیادی اداروں کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے پر تلی ہوئی ہے اور ارباب اقتدار کا واضح ہدف چند ہاتھوں میں اختیارات کا مکمل ارتکاز نظر آ رہا ہے جو سیدھا سیدھا تباہی کا راستہ ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ اداروں کی تباہی کو روکا جائے اور اختیارات کی تقسیم میں وہ توازن پیدا کیا جائے جو کسی بھی سیاسی اور اجتماعی نظام کے کامیابی سے چلنے اور قوم کو آمریت اور فسطائیت سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ ایک جمہوری اور شورائی نظام اور آمرانہ اور فسطائی نظام کا بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ جمہوری نظام میں دستور' قانون اور ادارے بالادست ہوتے ہیں جبکہ آمرانہ نظام دستور' قانون اور اداروں پر عملاً فرد واحد یا ایک گروہ کی مطلق العنانی مسلط کرتا ہے' خواہ بظاہر بڑی بڑی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاندار عمارتوں پر پارلیمنٹ' عدالت اور صحافت کے پرچم لہرا رہے ہوں۔ اس وقت ملک و قوم ایک نظر فریب جمہوری تماشے کے علی الرغم اسی نوعیت کے خطرات سے دوچار ہے اور یہ وقت ہے کہ دستور اور جمہوری اداروں کے تحفظ کے لیے ہر سطح پر موثر جدوجہد کی جائے تاکہ ملک مطلق العنانی اور فسطائیت سے محفوظ رہ سکے اور ریاست کے مختلف اداروں کے درمیان صحت مند توازن رونما ہو سکے جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہو۔ عدالت اور صدارت پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد حکومت کے سربراہ اپنے اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ اب دستور کی تبدیلی' بلکہ قلب ماہیت (metamorphosis) کے لیے کوئی پیکج تیار کیا جا رہا ہے۔ دستور کی تیرھویں اور چودھویں ترمیم سے اختیارات کا جو ارتکاز واقع ہوا ہے وہ بھی کافی نہیں سمجھا جا رہا ہے اور باوثوق اطلاعات کا ماحصل یہ ہے کہ ۱۹۷۳ کے دستور کی بحالی کے نام پر ایسی بنیادی تبدیلیاں لانے کی تیاری ہے جو ملک کے پارلیمانی نظام کو مکمل طور پر وزیر اعظمی نظام (Prime Ministerial System) میں تبدیل کر دیں گی۔ وزیراعظم صاحب کا ارشاد ہے: "میرے منصوبے موجودہ نظام میں فٹ نہیں ہوتے" (جنگ لاہور' ۴ جنوری ۹۸)۔ رپورٹوں کے مطابق وفاقی کابینہ سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم نے فرمایا ہے کہ موجودہ حکومت کو عوام کی طرف سے دیا گیا بھاری مینڈیٹ اس بات کا متقاضی ہے کہ موجودہ نظام اور حکومتی طریق کار میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں لائی جائیں۔ اس سلسلے میں قانون اور آئین میں موجودہ تمام ابہام اور پیچیدگیوں کو آئینی ترامیم کے ذریعے دور کر دیا جائے گا۔ (جنگ' ۱۳' ۱۸ جنوری ۹۸)

آئینی ترامیم کا رخ کس طرف ہو گا؟ اس سلسلے میں جنگ اور دی نیوز (۱۲ جنوری ۹۷) کی اطلاع یہ ہے کہ صدر مملکت کے اختیارات کو مزید کم کیا جا رہا ہے۔ ججوں کے تقرر کے لیے چیف جسٹس کے مشورے کی شرط کو ختم کیا جا رہا ہے' چیف الیکشن کمشنر' آڈیٹر جنرل اور پبلک سروس کمیشن کے سربراہ کے تقرر کا اختیار بھی وزیراعظم کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے۔ دستور میں بشمول دفعات ۷۵' ۹۰' ۱۶۸' ۲۱۳' ۲۶۰ بنیادی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اور یہ سب پارلیمنٹ کی بالادستی کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ وائس آف امریکہ نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان دستوری ترامیم کے نتیجے میں: "صدر کے اختیارات مزید کم ہو جائیں گے اور نواز شریف ڈکٹیٹر بن کر ابھریں گے"۔ (جسارت' ۴ جنوری ۹۸)

جس رخ پر موجودہ حکومت بگٹٹ چل پڑی ہے وہ بڑا خطرناک ہے اور اس رجحان کا بروقت نوٹس اور اس کے خلاف موثر مزاحمت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

یہ ایک عظیم سانحہ ہے کہ ہمارے ملک میں دستوری ترمیم کو طاقت کا کھیل بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ دستور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مقدس اور اہم ترین دستاویز ہوتا ہے جس پر کسی ملک کے پورے نظام کا انحصار ہو اور جو توازن اختیارات کا ضامن ہو۔ یہ پوری قوم اور تاریخ کی امانت ہوتا ہے اور کسی بھی فرد یا ادارے کو ذاتی مقاصد یا وقتی مصالح کی بنا پر اسے بازیچہ اطفال بنانے کا حق نہیں۔ دستور کسی ایک نسل کے لیے نہیں بلکہ نسلوں اور صدیوں کے لیے بنایا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ترمیم اور تبدیلی کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے لیکن یہ ترمیم اور تبدیلی بھی دستور کے مقاصد اور قوم کی تاریخی امنگوں کے تابع اور ان حدود کے اندر ہونی چاہیے جو دستور کی ترمیم اور تعبیر کے لیے مقرر اور معروف ہیں، ورنہ قانون کی حکمرانی ایک مذاق بن جائے گی اور ادارے درہم برہم ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دستور سازی اور عام قانون سازی کو دو الگ الگ کام قرار دیا گیا ہے۔ دستور سازی کی ذمہ داری اس ادارے کو دی جاتی ہے جسے قوم نے خاص طور پر اس کام کے لیے منتخب کیا ہو۔ عام قانون ساز ادارے (Parliaments) دستور کے تحت وجود میں آتے ہیں اور اس کے ارکان، نیز انتظامیہ اور عدلیہ، دستور کی حفاظت اور اس کی تنفیذ کا حلف اٹھاتے ہیں۔ انھیں دستور میں ترمیم کے محدود اختیارات ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن دستور کی تنسیخ یا اس کی قلب ماہیت کا اختیار حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دستوری قانون (Constitutional Law) میں مندرجہ ذیل دو اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ بالعموم دستوری ترمیم عام اکثریت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے خصوصی شرائط عائد کی جاتی ہیں، مثلاً پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت، یا وفاقی نظام میں پارلیمنٹ اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں سے ایک بڑی تعداد کی تائید (جیسا کہ امریکہ، بھارت اور دوسرے جمہوری ممالک میں ہے) یا پارلیمنٹ کی تائید کے علاوہ ریفرنڈم وغیرہ۔ اس طرح دستور کو دوام بھی حاصل ہوتا ہے اور تبدیلی کا امکان بھی باقی رہتا ہے۔

دوسرا اصول اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے اور اس کے ذریعے دستور میں ترمیم اور دستور کے بنیادی ڈھانچے اور تزویراتی نظام میں تبدیلی میں فرق کیا گیا ہے۔ Amendment سے مراد جزوی تبدیلی، کسی غلطی یا سہو کی اصلاح اور بنیادی ڈھانچا اور تزویراتی نظام کے مطابق کمی یا اضافہ اور اس کے فطری ارتقائی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔ اس کے خلاف یا اس سے متصادم کسی تبدیلی کو جائز ترمیم (legitimate amendment) نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بڑا ہی بنیادی مسئلہ ہے اور اس کی تفہیم اور احترام بے حد ضروری ہے اس لیے ہم اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک ترمیم (amendment) کے لغوی مفہوم کا تعلق ہے، وہ جزوی تبدیلی ہے، بنیادی تبدیلی نہیں۔ The Oxford Reference Dictionary 1986 کے مطابق amend کے معنی ہیں:

To correct an error in; to make minor alterations in. (p 23)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح Chambers 20th Century Dictionary کے مطابق اس کا مفہوم:

"To free from fault or error; to correct: to improve; to alter in detail with a view to improvement as a bill before parliament; to rectify; to cure; to mend".

Webster Third New International Dictionary کے مطابق ترمیم (amend) کا مقصد کسی غلطی یا کمی کو دور کرنا ہے اور اصلاً یہ لفظ اس چیز یا عمل کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کے ذریعے ایک پودے کو زمین میں پرورش پانے میں سہولت مل سکے۔ گویا پودے کی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے نمو کے عمل کو متاثر کرنے والی چیز کو دور کرنا یا تبدیل کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ دستوری قانون کے ماہرین اور اعلیٰ عدالتوں نے "ترمیم" کو تنسیخ یا بنیادی تبدیلیوں کے ہم معنی تصور نہیں کیا بلکہ ایسی تبدیلی جو دستور کے مقاصد اور بنیادی ڈھانچے کے مطابق ہے' اور جو اس سے متصادم ہے' ان میں فرق کیا ہے' اور ترمیم کے دائرے کو صرف اول الذکر تک محدود کر دیا ہے۔ اگر بنیادی ڈھانچے یا ریاست کے مقاصد میں تبدیلی کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے عوام سے نئے مینڈیٹ کو ضروری سمجھا ہے۔ دنیا کے کچھ دساتیر میں تو چند دفعات کو ناقابل تغیر قرار دے دیا جاتا ہے (جیسا کہ ایران میں ہے) لیکن باقی مقامات پر بھی کسی خاص وقت کی پارلیمنٹ کو یہ اختیار دینے میں تامل کیا گیا ہے کہ وہ دستور میں جب چاہے اور جو چاہے تبدیلی کرا دے۔ اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کی دستوری تاریخ پر ایک نظر ڈالنا مفید ہو گا۔

بھارت میں یہ مسئلہ ۱۹۷۳ میں ابھر کر سامنے آیا۔ بھارت کے دستور میں دفعہ ۳۶۸ ترمیم دستور کے بارے میں ہے' جس کی رو سے دستور میں ترمیم کے لیے لوک سبھا اور راجیا سبھا دونوں کی دو تہائی اکثریت ضروری ہے اور کچھ معاملات میں اس کے ساتھ کم از کم نصف صوبائی ریاستوں کی مقننہ کی حمایت ضروری ہے۔ بنیادی حقوق کے سلسلے میں ایک مقدمے میں' جسے Kesavananda Vs. Kerala کے نام سے پکارا جاتا ہے' (AIR 1973 SC 1461) بھارت کی سپریم کورٹ نے یہ اصول طے کیا کہ پارلیمنٹ کو بنیادی حقوق یا دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کا حق نہیں' اس لیے کہ ان کا تعلق ریاست کے مقصد اور اس کے وجود کے جواز سے ہے۔ اس لیے ہر ایسی ترمیم جو ان کو متاثر کرے غیر قانونی متصور ہو گی۔ اندرا گاندھی بمقابلہ راج نرائن (AIR 1973 SC 2299) میں سپریم کورٹ نے پھر اس اصول کی توثیق کی اور یہ دستوری پوزیشن طے کی کہ دفعہ ۳۶۸ پارلیمنٹ کو ترمیم دستور کا مطلق حق نہیں دیتی بلکہ اس حق کو صرف جزوی تبدیلی تک محدود کرتی ہے۔ مطلق' بنیادی یا انقلابی تبدیلی کا اختیار کسی پارلیمنٹ کو حاصل نہیں جو دراصل دستور ساز ادارہ نہیں بلکہ دستور کے تحت وجود میں آنے والا ایک ادارہ ہے۔ وہ نہ دستور کی تنسیخ کر سکتا ہے اور نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بنیادی ڈھانچے کو تبدیل کر سکتا ہے۔ البتہ اس ڈھانچے کے مطابق جزوی تبدیلی کا حق اسے حاصل ہے۔ اس فیصلے کو غیر موثر بنانے کے لیے بھارتی وزیراعظم (اندرا گاندھی) نے دستور میں بیالیسویں ترمیم کر ڈالی جس کے ذریعے آرٹیکل ۳۶۸ میں دو شقوں ۴ اور ۵ کا اضافہ کیا گیا۔

دفعہ ۴ کے ذریعے قرار دیا گیا کہ اس آرٹیکل کے تحت جو ترمیم بھی کی جائے گی اسے کسی بھی بنیاد پر کسی بھی عدالت میں زیر بحث نہیں لایا جا سکے گا۔ دفعہ ۵ کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

5- For removal of doubts it is hereby declared that there shall be no limitation on the constitutional powers of Parliament to amend by way of addition, variation or repeal the provisions of the constitution under this article.

ترجمہ: شبہات دور کرنے کے لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے اس آرٹیکل کے تحت، دستور کی دفعات میں اضافے، تبدیلی یا تنسیخ کے ذریعے ترمیم کرنے کے پارلیمنٹ کے دستوری اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہو گی۔

بھارت کی سپریم کورٹ نے ۱۹۸۰ میں منروا ملز کیس (Minerva Mills Case AIR 1980 SC 1789) میں اس دستوری ترمیم کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ آرٹیکل ۳۶۸ میں اس ترمیم کا (یعنی شق ۴ اور ۵ کے اضافے) کا پارلیمنٹ کو حق نہیں تھا اس لیے اسے خلاف قانون اور غیر موثر قرار دیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کہ پارلیمنٹ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں کر سکتی، قائم اور برقرار ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اس فیصلے کے بعد نہ تو سپریم کورٹ پر کوئی ہلہ بولا گیا، نہ چیف جسٹس اور متعلقہ ججوں کی چھٹی کی گئی اور نہ پارلیمنٹ نے اسے اپنے حقوق پر دست درازی تصور کیا۔ سب نے سپریم کورٹ کے طے کردہ اس دستوری اصول کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور قانون کی بالادستی اور اداروں کے استحکام کا راستہ اختیار کیا۔

پاکستان میں دستور کے ساتھ جو مذاق بار بار ہوتا رہا ہے وہ ہمارے سیاسی عدم استحکام کی اصل وجہ ہے۔ جس ملک میں دستور کا حلف اٹھانے والے ہی اسے اپنی ذاتی مصلحتوں یا مفادات کی خاطر جب چاہیں پھاڑ کر پھینک دیں یا اس میں ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اس کا حلیہ ہی بگڑ جائے تو پھر اس ملک میں قانون اور حقوق کا کیا حشر ہو گا، گویا:

آئین چمن بندی بھی نہیں، دستور نوا سنجی بھی نہیں
اب اس سے زیادہ گلشن کا شیرازہ پریشاں کیا ہو گا؟

یہی وہ خلفشار ہے جس سے ملک و قوم کو بچانے کے لیے سپریم کورٹ نے چیف جسٹس حمود الرحمٰن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دور میں عاصمہ جیلانی کیس میں ایک تاریخی فیصلہ دیا تھا جس کے ذریعے چیف جسٹس منیر کے ماضی کے فیصلے کو کالعدم کیا گیا اور مستقبل کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا کہ قانون کی حکمرانی صرف دستور کے احترام ہی سے ممکن ہے، اس سے انحراف یا اس کی تنسیخ غداری کے مترادف ہے۔ بڑے محکم دلائل دینے کے بعد چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے لکھا:

"اس تجزیے کی بنیاد پر میں، فاضل چیف جسٹس کے لیے احترام کے بہترین جذبات کے ساتھ، اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے Kelson Theory کی تعبیر کرنے اور اسے اپنے سامنے پیش مقدمے کے حالات و واقعات پر منطبق کرنے میں غلطی کی۔ میری حقیر رائے میں، انھوں نے جو اصول بیان کیا ہے اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے (wholly unsustainable)۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ کہوں کہ اسے اچھا قانون قرار نہیں دیا جا سکتا"۔

چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے یہ تاریخی الفاظ بھی لکھے کہ پاکستان میں ناقابل تغیر دستوری ڈھانچا قرارداد مقاصد ہے جسے اس دستور ساز اسمبلی نے طے کیا تھا جو قیام پاکستان کے وقت دستور سازی کے لیے منتخب کی گئی تھی اور اس سے کوئی انحراف ممکن نہیں۔ انھوں نے لکھا:

"بہرصورت اگر ہمارے لیے کوئی اعلیٰ معیار (grand norm) ضروری ہے، تو مجھے اسے معلوم کرنے کے لیے مغرب کے قانونی ماہروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اپنا اعلیٰ معیار، ہمارے اپنے عقیدے کا حصہ ہے، یعنی یہ کہ پوری کائنات پر قانونی حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور لوگ جو اختیار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتے ہیں، ایک مقدس امانت ہے۔ یہ ناقابل تغیر و تبدل اصول قرارداد مقاصد میں، جسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۷ مارچ ۱۹۴۹ کو منظور کیا تھا، واضح طور پر تسلیم کیا گیا تھا"۔

جسٹس یعقوب علی نے چیف جسٹس کے فیصلے کی تائید کی مگر اپنے جداگانہ فیصلے میں نہ صرف یہ کہ قرارداد مقاصد کی اس اساسی حیثیت کی تائید و توثیق کی بلکہ جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خاں دونوں کے دستور کی تنسیخ کے عمل کو ایک غیر قانونی اور باغیانہ فعل قرار دیا جسے کبھی سند جواز نہیں دی جا سکتی، اور ہر دور کے آمروں کو متنبہ کیا کہ دستور میں اس نوعیت کی دراندازیوں کو کبھی بھی "جائز قانون سازی" تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے لکھا:

"ہو سکتا ہے کہ ریاست کے جبریہ اقتدار کی وجہ سے، عوام اور عدالتیں عارضی طور پر خاموش ہو جائیں لیکن یہ یقینی طور پر قرار دیا جانا چاہیے کہ یہ غاصب جو حکم دیں گے وہ غیر قانونی ہو گا اور عدالتیں ان کے قواعد کو تسلیم نہیں کریں گی اور نہ ان کو قانونی قرار دے کر ان کے مطابق عمل کریں گی۔ جیسے ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا پہلا موقع آئے جب غاصب کے ہاتھ میں ریاست کا جابرانہ نظام نہ رہے، اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جانا چاہیے اور مناسب سزا دی جانی چاہیے۔ صرف یہی چیز بعد کے مہم جوؤں کو روکنے کا باعث بنے گی"۔

بدقسمتی سے طالع آزما قانون کی گرفت سے بچے رہے جس کی وجہ سے بگاڑ کی یہ راہیں مسدود نہ ہو سکیں۔ لیکن عدلیہ کے مثبت کردار سے سیاہ و سپید اور جائز اور ناجائز ایک دوسرے سے ممتاز و ممیز ہو گئے اور مستقبل کے خطرات اور ان کے مقابلے کے نشان راہ واضح ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے دستور کی تنسیخ کی جگہ اس کی معطلی (abeyance) کا راستہ اختیار کیا اور عدالتوں نے بھی اسے دستوری انحراف (constitutional deviation) قرار دیا۔ جب عارضی دستوری حکم نامہ (Provisional Constitutional Order) لاگو کیا گیا تو اس وقت کے چیف جسٹس اور ججوں کی ایک تعداد نے حلف لینے سے انکار کر دیا اور مارشل لا کے نظام میں ایسی دراڑیں پڑ گئیں کہ بالاخر ۱۹۸۵ میں جمہوریت بحال ہوئی۔

نصرت بھٹو کیس میں بھی چیف جسٹس نے قرارداد مقاصد کو ملک کا بنیادی قانون قرار دیا اور اس کے بعد بھی اعلیٰ عدالتوں نے اس قرارداد اور اس کے اصولوں کو دستوری بنیادی ڈھانچے کے طور پر تسلیم کیا۔ نیز آہستہ آہستہ ہماری عدالتوں نے بھی دستور کے بنیادی ڈھانچے کے اصول کی توثیق کی جو بالآخر اچکزئی کیس میں سپریم کورٹ کے فل بنچ فیصلے کی شکل میں دستور کا حصہ بن گیا۔ ضرورت ہے کہ اس فیصلے کو بغور پڑھا جائے اور ملک کے سیاستدان، وکلا اور ارکان پارلیمنٹ اس کی روشنی میں دستوری معاملات طے کرنے کی کوشش کریں۔

"یہ امر غیر متنازع ہے کہ تینوں دساتیر میں قرارداد مقاصد مشترک ہے اور اس کو تینوں دساتیر میں، بشمول ۱۹۷۳ کا دستور، بطور مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ کے دستور کی بحالی ان تمام شبہات کو دور کرتی ہے جو پی سی او (PCO) کے نفاذ سے پیدا ہو سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا ارادہ دستور کو، صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن قائم کرنے کے لیے ترامیم کے ساتھ بحال کرنے کا تھا، اور دستور میں اسلامی دفعات شامل کرنا بھی تھا جس کے لیے قرارداد مقاصد میں واضح طور پر بنیاد فراہم کر دی گئی تھی---

اس لیے ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ آٹھویں ترمیم، بشمول دفعہ ۵۸ (۲) ب دستور کے مستقل فیچر کے طور پر قائم رہنے کے لیے ہے۔ صدر کے لیے یہ راستہ کھلا ہے کہ دفعہ ۲۳۹ کے تحت دستوری ترمیم کے ذریعے آٹھویں ترمیم کی کسی دفعہ میں ترمیم کرے، جب تک کہ قرارداد مقاصد میں جو اب ۱۹۷۳ کے دستور کا مقدمہ اور دفعہ ۲ کے تحت دستور کا قابل عمل (substantive) حصہ ہے، درج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وفاقیت، پارلیمانی جمہوریت اور اسلامی دفعات کے اساسی اصولوں کو نہ چھیڑا جائے"۔

سپریم کورٹ کے فل بنچ کا یہ فیصلہ دستور کے بنیادی ڈھانچے اور صرف اس کے اندر ترمیم کے اصول کو بالکل صاف الفاظ میں طے کر دیتا ہے۔ اس لیے ملک کی تمام دینی اور سیاسی قوتوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ انھیں صرف دستوری ترامیم کے ایک ایسے پیکج پر قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو قرارداد مقاصد کے مطابق دستور کے بنیادی ڈھانچے یعنی اسلام، پارلیمانی جمہوریت، وفاقیت، حقوق انسانی کے تحفظ، عدلیہ کی آزادی، توازن اختیارات اور قانون کی بالادستی کو مستحکم کرنے والا ہو اور ہر ایسی ترمیم کی ڈٹ کر مزاحمت کی جائے جو کسی بھی رنگ میں ارتکاز اختیارات اور ایک فرد، گروہ یا ادارہ کی مطلق العنانی کی راہ ہموار کرنے والی ہو۔

چونکہ نئے دستوری پیکج کا رشتہ عوامی مینڈیٹ سے جوڑا جا رہا ہے اس لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ عوامی مینڈیٹ کی صحیح حقیقت کو بھی صاف الفاظ میں متعین کر لیا جائے۔ ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۷ تک پانچ انتخاب ہوئے ہیں لیکن یہ سب ۱۹۷۳ کے دستور کے تحت قانون ساز اداروں کے انتخاب تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے لیے نہیں تھا۔ پھر ۱۹۹۷ کے انتخابات تو غیر معمولی حالات میں ہوئے جن کا ملک کی عظیم اکثریت نے انتخابی بائیکاٹ کیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک تہائی ووٹرز نے انتخابات میں شرکت کی حالانکہ تمام ملکی اور غیر ملکی آزاد مبصرین کے مطابق اصل شرکت بمشکل بیس سے پچیس فیصد ووٹرز نے کی۔ کامیاب ہونے والی جماعت کو کل ووٹرز کے زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ فی صد کی تائید حاصل تھی۔ لیکن اگر ہم تعداد کے مسئلے کو نظرانداز کر دیں اور توجہ اصل مسائل پر مرکوز کریں، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ نے جو منشور ۱۹۹۷ کے انتخابات میں قوم کے سامنے پیش کیا اس میں بلاواسطہ دستوری ترامیم کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ پورے منشور میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں دستور یا اس کے کسی حصے کے بارے عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا اور اس میں ترمیم کے لیے کوئی حق عوام سے حاصل کیا گیا ہو۔ ہم نے میاں نواز شریف صاحب کے اس منشور کا ان کے تعارف سمیت بغور مطالعہ کیا ہے اور جو شخص بھی اس کا مطالعہ اور تجزیہ کرے گا ہماری اس رائے سے اتفاق کرے گا کہ اس میں بنیادی یا انقلابی دستوری ترامیم کے مسئلے سے قطعاً تعرض نہیں کیا گیا۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ جن امور کو دستوری ترمیم کا معاملہ قرار دیا جا سکتا ہے، وہ صرف یہ ہیں:

۱۔ آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی محدود کرنا (گو عملاً اس حکومت کے پہلے دس مہینوں میں ۱۸ آرڈیننس جاری ہوئے ہیں)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- سیاسی وفاداری میں تبدیلی اور ہارس ٹریڈنگ کے خاتمے کے لیے آئین میں ترمیم (جو چودھویں ترمیم کی شکل میں کی گئی ہے جس کا مقصد صحیح مگر انداز قابل تنقید ہے کہ اس طرح پارٹی سربراہ کی مطلق العنانی قائم ہو جائے گی)۔

۳- قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو معاشرے کے مختلف طبقات کا بھرپور نمایندہ بنانے کے لیے پارلیمنٹ کی نشستوں میں اضافہ، خواتین اور مختلف پیشوں سے ماہرین کو متناسب نمایندگی کے تحت پارلیمنٹ میں نمایندگی دینا۔

۴- منتخب نمایندوں کے اثاثوں کا سرعام اعلان، صوابدیدی اختیارات کا خاتمہ یا انھیں "انتہائی محدود" کرنا، وزیروں اور مشیروں کی فوج ظفر موج کی حوصلہ شکنی اور وزیروں اور مشیروں کی تعداد کی حد مقرر کرنا، نیز نجی کاروبار میں مصروف منتخب نمایندوں پر منصب کی بنیاد پر مفادات حاصل کرنے پر قانون (conflict of interest legislation) کے ذریعے واضح پابندی (ان میں سے کسی پر عمل نہیں ہوا بلکہ وزیروں اور مشیروں کی فوج میں اضافہ ہوا ہے)۔

۵- جج صاحبان کی تعداد میں اضافہ (جس کا حشر سپریم کورٹ میں طے شدہ تعداد کو بھی کم کرنے کی کشمکش میں دیکھا جا سکتا ہے)۔

۶- احتساب کے عمل کو مستحکم کرنا، ہر سول ملازم اور منتخب نمایندے پر لازم ہو گا کہ وہ باقاعدگی سے اپنے مالی مفادات اور اثاثوں کا اظہار کرے اور یہ ریکارڈ عوامی معائنے کے لیے کھلا رکھا جائے نیز عوامی نمایندوں اور ریاستی عہدہ داروں کے خلاف بدعنوانی کی عوامی شکایات کی تفتیش کے لیے ایک خود مختار اور بااختیار ادارہ موجود رہے۔ یہ تفتیش اور استغاثے کے لیے اپنا علیحدہ انتظام رکھے (جس کا حشر وزیراعظم کے دفتر میں احتساب سیل کے قیام کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے)۔

پورے منشور میں یہ چھ امور ایسے ہیں جنھیں بالواسطہ یا بلاواسطہ دستوری ترمیم سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ ان میں نہ آٹھویں ترمیم کا ذکر ہے، نہ صدر کے اختیارات کا اور نہ عدلیہ کے دستوری حقوق و فرائض کی تنظیم نو کا۔۔۔ اگر آپ کا منشور ہی ان تمام امور سے خالی تھا تو پھر آپ کو مینڈیٹ کیسے حاصل ہو گیا؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دستور میں دو ترامیم موجودہ حکومت نے پارلیمنٹ سے جس انداز میں کروائی ہیں وہ اس حکومت کے انداز حکمرانی کی غماز اور اس کے طریق واردات کی مظہر ہیں۔۔۔ جمہوریت اور پارلیمنٹ کے چہرے پر ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدنما داغ ہیں۔ جس آٹھویں ترمیم پر اتنا شور و غوغا ہے اس پر قومی اسمبلی نے پورے چالیس دن اور سینیٹ نے سات دن بحث کی۔ دلیل اور سیاسی دباؤ کے ذریعے اصل مسودے میں پندرہ کے قریب ترامیم کرائیں جس کے ذریعے نیشنل سیکورٹی کونسل کے ادارے کو ختم کیا گیا' صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں کچھ توازن پیدا کیا گیا' اسمبلی کی تحلیل کو جوڈیشل ریویو کے لیے کھولا گیا' وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کے انتخاب کے کام کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی طرف منتقل کیا گیا اور نویں دستوری ترمیم کے لیے حکومت سے حتمی وعدہ لیا گیا جو پورا نہ ہوا۔ اس کے برعکس ذرا غور کریں کہ تیرھویں اور چودھویں ترمیم کا ڈراما کس طرح اسٹیج کیا گیا۔

پانچ پانچ گھنٹے میں اتنی بنیادی ترامیم' کسی بحث کے بغیر' تمام قواعد و ضوابط معطل کر کے منظور کرالی گئیں۔ یہ قانون سازی نہیں دستور کے ساتھ مذاق ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی پارلیمنٹوں کی تاریخ میں ایسی سرعت اور سہل انگاری سے دستوری ترامیم کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

ہم نے یہ دونوں مثالیں اس لیے دی ہیں کہ ہمیں خطرہ ہے کہ آیندہ بھی دستوری ترامیم کے لیے ایسے ہی ڈرامے نہ اسٹیج کیے جائیں۔ اس کی موثر مزاحمت ہونی چاہیے۔ دستوری پیکج کی تیاری کا کام اس طرح کرنا' دستور' قانون' اخلاق اور جمہوری آداب کے منافی ہے۔ اگر دستور میں کچھ کمزوریاں ہیں یا دستور کے ڈھانچے کے مزید موثر بنانے کے لیے کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے تو ان پر کھل کر علمی اور عوامی سطح پر بحث ہونی چاہیے۔ دستوری تجاویز مرتب کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے ارکان اور دوسرے اہل علم و تجربہ پر مشتمل کمیشن بننا چاہیے جو تمام عوامی اور علمی حلقوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تجاویز پیش کرے۔ ان پر کھلی بحث پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ کے باہر ہونی چاہیے تاکہ دن کی پوری روشنی میں' اور زیادہ سے زیادہ قومی اتفاق رائے پیدا کر کے' دستور میں ترامیم ہوں۔ ان کے ایک ایک لفظ پر غوروخوض کے بعد انھیں کتاب آئین میں مرقوم کیا جائے۔ اس سے ہٹ کر جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ فساد اور بگاڑ کا طریقہ ہے اور اس سے کبھی خیر رونما نہیں ہو سکتا۔

اس موقع پر ایک اور اصولی اور بنیادی بات کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم یہ بات ایک قومی اور تاریخی امانت کے طور پر پیش کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ وزیراعظم صاحب کا ذہنی میلان اپنی ذات میں اختیارات کے زیادہ سے زیادہ ارتکاز کی طرف ہے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا رخ اسی سمت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۱ میں جس دستوری ترمیم کا مسودہ بارھویں ترمیم کے طور پر تیار ہوا تھا اس کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس مجوزہ دستوری ترمیم میں غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خصوصی ٹربونل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنانے اور وزیراعظم کے لیے دستور کی کسی بھی شق کو اپنی صوابدید پر معطل کرنے کا اختیار حاصل کرنے کی کوشش کی گئی--- یعنی پارلیمنٹ، سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت، بنیادی حقوق غرض دستور کی کسی بھی شق کو وقتی طور پر معطل کرنے کا حق وزیراعظم کو دینا پیش نظر تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ مسودہ ہائی کورٹ کے ایک "سابق جج کے مشورے بلکہ انھی کی ڈرافٹنگ سے تیار ہوا تھا اور اسے کابینہ نے بھی منظور کر لیا تھا۔ جب محترم قاضی حسین احمد اور میں نے اس کی مخالفت کی تو وزیراعظم صاحب کو سخت دھچکا لگا۔ اس وقت کے صدر غلام اسحق صاحب نے بھی اس پر سخت تنقید کی۔ جب مخالفت کھل کر سامنے آئی تو کابینہ کے ارکان پریشان ہوئے اور کم از کم دو ارکان کابینہ (یعنی حامد ناصر چٹھہ اور جنرل مجید ملک) نے برملا کہا کہ ہم نے کابینہ میں پورے غور و تجزیے کے بغیر ہی اس تجویز کو منظور کر لیا تھا۔ سینیٹ کے چیئرمین وسیم سجاد صاحب نے بھی اس مجوزہ ترمیم کو ختم کرنے اور اس کی جگہ ایک ایسی ترمیم کا مسودہ تیار کرنے میں بڑا مثبت کردار ادا کیا جو صرف لاقانونیت کے مقابلے کے لیے صرف دو سال کے لیے ٹربیونل بنانے پر مشتمل تھی۔

اس واقعے کے تین پہلو ایسے ہیں جن کے بارے وارننگ اور پیش بندی ضروری ہے:

اول: جناب نواز شریف کا یہ رجحان کہ سارے اختیارات ان کے ہاتھوں میں مرکوز ہوں، یہ جمہوریت اور شورائیت کی ضد اور آمریت کی راہ ہموار کرنے والی چیز ہے۔

دوم: کابینہ کا بڑے اہم معاملات پر سے بھی اس روا روی میں گزر جانا اور قانون سازی کے لیے جس احتیاط، مشورے اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہے، اس کا اہتمام نہ کرنا۔

سوم: ہمارے کچھ سابق ججوں کا رویہ جو ایک مدت تک انصاف کی کرسی پر بیٹھنے اور دستور اور قانون کے محافظ ہونے کے باوجود جب سیاست میں آتے ہیں تو ایسے ایسے گل کھلاتے ہیں کہ

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

اس واقعے کے بارے میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ حرف بہ حرف مبنی بر حقیقت ہے اور اس نازک لمحے کو ریکارڈ پر لانے کا مقصد کسی کو مطعون کرنا نہیں بلکہ مستقبل کے بارے میں قوم کو متنبہ کرنا ہے۔

آخر میں ہم قوم اور اس کے تمام ذمہ دار افراد سے یہ اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ ملک کو تصادم اور دستوری خلفشار سے بچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ پارلیمنٹ کے ارکان سے بھی ربط قائم کریں اور انھیں خدا کا خوف دلائیں اور یاد دلائیں کہ انھیں پھر عوام کے سامنے آنا ہو گا۔ نیز علما، قانون دان حضرات اور سیاسی قائدین سے گزارش ہے کہ دستور کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور بجائے اس کے کہ حکومت کوئی دستوری پیکج لائے، قوم کے سوچنے سمجھنے والے عناصر مثبت طور پر دستوری ترامیم کا ایک صحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مند پیکج تیار کریں جسے قوم کے دل کی آواز قرار دیا جا سکے اور جس کے حق میں اتنی رائے عامہ منظم کی جا سکے کہ اس سے ہٹ کر کسی اور صورت میں دستور میں ترامیم ممکن نہ رہیں۔ جس طرح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے سرکردہ علما نے ۱۹۵۲ میں دستوری بحث کو ایک ایسا رخ دے دیا تھا کہ آیندہ کی دستور سازی اس سے منحرف نہ ہو سکی' اس طرح اس وقت بھی ضرورت ہے دستور کے اصل ڈھانچے کو قرارداد مقاصد کی روشنی میں مستحکم کرنے اور مزید ترقی دینے کے لیے جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے' ان کو واضح کیا جائے' اختیارات کی تقسیم میں مناسب توازن قائم کیا جائے اور حکومت اور پارلیمنٹ کو ایک قومی اتفاق رائے کے تحت انھیں منظور کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جن بنیادی اصلاحات کی ضرورت ہے ان کا ایک مجمل خاکہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ دستور میں سب سے اہم ترمیم شریعت کی بالادستی اور اسے ملک کا بالا ترین قانون (supreme law) تسلیم کرانے کے لیے ہونی چاہیے۔ اس کا عہد اسلامی جمہوری اتحاد نے اپنے ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ کے منشور میں کیا تھا۔ اس سے پہلے قومی اسمبلی اور سینیٹ نے نویں دستوری ترمیم کی شکل میں اس کا وعدہ کیا تھا اور سینیٹ نے یہ ترمیم متفقہ طور پر منظور بھی کر لی تھی۔ اور خود نواز شریف صاحب نے ۱۹۹۱ میں پارلیمنٹ کے اس مشترک اجلاس میں جو رمضان کے مبارک مہینے میں منعقد ہوا تھا' اس کا وعدہ کیا تھا اور اس پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہو گیا تھا کہ دستور کی دفعہ ۲ میں مزید ترمیم کر کے یہ اضافہ کیا جائے گا کہ شریعت اسلامی ملک کا بالاترین قانون ہو گی اور شریعت کی تعریف وہ اسلامی احکام ہوں گے جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

۲۔ دستور میں آرٹیکل ۴ اور ۵ بڑے بنیادی آرٹیکل اور پورے قانونی نظام کی بنیاد ہیں۔ مندرجہ بالا ترمیم (شریعت کی بالادستی) کی روشنی میں ان دونوں دفعات میں یہ ضروری ترمیم کر دی جائے یعنی:

--- دفعہ ۴ میں ملک کے تمام افراد کے اس حق کو تسلیم کیا جائے کہ ان سے شریعت اور قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا --- اور

--- دفعہ ۵ میں یہ وضاحت ہو جائے کہ شریعت کے خلاف ہر قانون' حکم' ہدایت' فیصلہ یا عمل درآمد جو کسی بھی وقت جاری ہو یا اٹھایا جائے وہ کالعدم ہو جائے گا۔

۳۔ دستور کے آرٹیکل ۳۱ میں مرقوم حکومتی پالیسی کے راہنما اصول کے نفاذ کے لیے ایک موثر مشینری وجود میں لائی جائے گی جو ایک متعین مدت میں ان پر مکمل عمل درآمد کو یقینی بنائے گی جس کے بعد یہ حقوق بھی باقی حقوق کی طرح نافذ العمل ہو جائیں گے۔

۴۔ دستور کے آرٹیکل ۴۵ اور ۲۴۸ میں جو اختیارات اور تحفظات شریعت کے منافی ہیں' وہ ختم کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیے جائیں گے۔

۵- وزیراعظم کے لیے مسلمان ہونا جیسا کہ وزارت عظمیٰ کے حلف نامے سے واضح ہے دستور کی دفعہ ۹ میں شامل کر لیا جائے گا۔

۶- وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار وسیع کر کے تمام قوانین اور عدالت اور انتظامیہ کے ضوابط کار کو اس کے دائرہ اختیار (jurisdiction) میں لے آیا جائے گا' نیز وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس اور ججوں کا تقرر بھی مستقل ہو گا۔ انھیں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کا تحفظ اور اختیار حاصل ہو گا۔ ان کے تقرر' منتقلی' مناصب کار کی تبدیلی وغیرہ کے سلسلے کی تمام امتیازی دفعات (provisions) ختم کر دی جائیں گی اور عدلیہ کی آزادی اور انتظامیہ کے علیحدگی کے تمام اصول و قواعد وفاقی شرعی عدالت اور باقی اعلیٰ عدالتوں میں یکساں ہوں گے۔ وفاقی شرعی عدالت کو اپنے دائرے میں دست گیری (relief) کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

۷- سینیٹ کو مزید اختیارات دیے جائیں' خصوصیت سے مالی معاملات میں بحث اور مشورے کا حق' تمام بین الاقوامی معاہدات کی توثیق کا حق' چند اہم تقرریوں کی توثیق۔

۸- ریاست کے اہم اداروں بشمول بری' بحری اور فضائی سربراہوں' چیف جسٹس آف پاکستان' چیف الیکشن کمشنر' پبلک سروس کمیشن کا سربراہ اور آڈیٹر جنرل کے تقرر کے لیے واضح ضابطہ--- اور ناموں کی تجویز کے لیے ایسا نظام جو سیاسی دراندازی سے پاک اور خالص میرٹ پر مبنی ہو۔ جو تقرریاں سیاسی نوعیت کی ہوں ان کے لیے حکومت اور اپوزیشن میں مشورے کا نظام قائم کیا جائے یا سینیٹ کی متعلقہ کمیٹیوں سے منظوری لی جائے جس طرح دنیا کے جمہوری ممالک میں ہے۔

۹- عدلیہ کی انتظامیہ سے مکمل علیحدگی' عدلیہ کی آزادی اور عدلیہ سے سبک دوش ہونے والے ججوں کے لیے ایسا انتظام کہ ان سے قومی امور میں پورا پورا فائدہ تو اٹھایا جا سکے مگر منافع والے منصب (office of profit) کا لالچ باقی نہ رہے۔ نیز سپریم کورٹ کے ۲۰ مارچ کے فیصلے کے مطابق طے شدہ اصولوں کو دستوری تحفظ دیا جائے۔

۱۰- پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کی مدت پر ازسرنو غور مناسب ہو گا۔ اسے کم سے کم چار سال کر لیا جائے تاکہ عوامی مینڈیٹ کی جلد تجدید ہو سکے۔ نیز پارلیمنٹ کے ممبران کی تعداد بڑھانے اور تمام موثر طبقات بشمول خواتین کی نمایندگی کے لیے مناسب انتظام۔ اس سلسلے میں متناسب نمایندگی کے نظام کو مکمل یا جزوی طور پر اختیار کرنا مفید ہو سکتا ہے۔

۱۱- صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن اور حکومت انتظامیہ اور پارلیمنٹ کے لیے ایسا انتظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ حکومت اور پوری انتظامی مشنری پر پارلیمنٹ کی بالادستی اور گرفت موثر ہو سکے اور پارلیمنٹ عملاً حکومت اور انتظامیہ کی یرغمال (hostage) نہ بن جائے۔

۱۲۔ احتساب کے نظام کو ایک مستقل بالذات بااختیار نظام کے طور پر قائم کرنا، اسے دستوری تحفظ، مالی آزادی اور تفتیش اور استغاثے کے لیے ان کا اپنا آزاد نظام، نیز حکومت اور عوام کی تحریک پر ازخود کارروائی (suo motto) کا اختیار۔

۱۳۔ وفاقی نظام کو اس کی حقیقی اسپرٹ کے ساتھ روبہ عمل لانا۔ دستور میں موجود تقسیم اختیارات کی عملی تنفیذ اور ایک متعین مدت میں صوبوں اور لوکل باڈیز میں انتظامیہ، ٹیکسیشن، پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ اور دوسرے تمام میدانوں میں اختیارات کی حقیقی منتقلی (devolution of power)۔

۱۴۔ سود اور قرض کی معیشت سے نجات۔

۱۵۔ تعلیم، صحت، رہایش، دولت کی منصفانہ تقسیم، روزگار کے مواقع کی فراہمی اور جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے شہریوں کے حقوق کے منشور (charter) کی تیاری اور ان پر دستوری ضمانت کے ساتھ عمل درآمد کا موثر نظام۔

۱۶۔ معاشی خودانحصاری کے حصول اور خسارے کی بجٹ سازی پر پابندی کے لیے دستوری اور قانونی انتظام۔

یہ وہ سولہ نکات ہیں جن کے بارے میں دستور، قانون اور پالیسی ہر سطح پر موثر کارکردگی کی ضرورت ہے۔ قرارداد مقاصد کی روشنی میں زندگی کا جو نقشہ بننا چاہیے وہ اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام امور پر توجہ دی جائے، دستور کو بھی انھی مقاصد کے لیے موثر بنایا جائے اور حکومت اور عوامی سطح پر بھی ان کے حصول کے لیے جدوجہد ہو۔ اسے قومی ایجنڈے کی حیثیت سے اختیار کرنے کی سعی کی جائے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ ان شاء اللہ آیندہ صدی میں پاکستان ان اصل مقاصد کی عملی تصویر بن سکے گا جن کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا اور پھر یہ قوم علاقائی اور عالمی ہر میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے گی۔

© rasailojaraid.com